AL-IDRAK RESEARCH JOURNAL

OPEN ACCESS
Al-Idrak
Research Journal
ISSN (Online): 2789-3227
ISSN (Print): 2789-3235
www.alidrakresearchjournal.com

تشکیلِ جدیدیت کے چند تاریخی عناصر

Genealogy of Modernity: Some Constituents

☆**Dr. Mohammad Rasheed Arshad**
Assistant Professor, Department of Philosophy, University of the Punjab, Lahore.

Citation:
Arshad, Dr. Mohammad Rasheed," Genealogy of Modernity: Some Constituents "Al-Idrāk Research Journal, 2, no.2, Jul-Dec (2022): 20– 35.

ABSTRACT

To understand modernity as a phenomenon or event, these facts cannot be ignored that many events at minor and major levels have been participating actively in the process of shaping modernity. It took time for its development. All attempts to comprehend it separately from the context of history of the past, will be futile and it would be impossible to grasp it as a subject. Therefore, to discuss modernity and its consequences, it is but necessary to explore the important historical elements involved in the formation of modernity. Modernity cannot be confined to merely an event of 21st century. Ancient civilizations of Greece and Roman, the Renaissance, the Reformation, the movement of Romanticism etc., all of them nurtured modernity in their own way. In this article, all contributing factors in the development of modernity from ancient Greece till today have been analyzed keeping in view the historical elements of worth importance.

Key Words: Modernity, Ancient Civilizations of Greek and Roman, Renaissance, Reformation, Romanticism

ابتدائیہ

عمومی طور پہ جدیدیت کو بطورِ مظہر یا واقعہ سمجھنے کی کوشش میں ان حقائق کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ جدیدیت کی ابتداء، تشکیل اور نشوونما کے پس پشت کئی واقعات کی کارفرمائی سرگرمِ عمل رہی ہے۔ جدیدیت کو تاریخ کے کسی ایک موڑ پہ اچانک نمودار ہونے والا واقعہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ جب اسے ماضی کی تاریخ کے حوالے سے علیحدہ کر کے سمجھنے کی کوشش کی جائے تو اسے اچانک نمودار ہونے والے واقعہ سمجھا جاتا رہے گا اور اس کا موضوع کی حیثیت سے اسکا گرفت میں رہنا ناممکن رہے گا۔ لہٰذا جدیدیت اور اسکے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورتحال کو ایک کل میں دیکھنے کیلئے تشکیل جدیدیت میں شامل اہم نوعیت کے تاریخی عناصر کی کھوج بے حد ضروری ہے۔ اسے

محض بیسویں اکیسویں صدی کی تاریخ تک محدود نہیں کیا جاسکتا۔ خواہ وہ قدیم یونان کی فکر ہو یا رومی تہذیب، نشاۃ الثانیہ ہو کہ رومانویت اور تحریک انتقاد، ان سب نے زمانہ حال میں واقع جدیدیت کی پرورش اپنے ڈھنگ سے کی۔ ان تمام تاریخی عناصر کا گہرائی میں مطالعہ کرنے اور تاریخی سیاق وسباق کے تحت ان ادوار کا جائزہ لیتے ہوئے جدیدیت اور اس کے اثرات کو واضح شکل میں دیکھنے کے قابل ہو سکتے ہیں۔

یونانی دور

جدیدیت کی ابتدائی کارفرمائی کے نسبتاً کامل نمونے یونانی روایت میں واضح دکھائی دیتے ہیں۔[1] اگر ہم اپنی آسانی کیلیے یونانی روایت کے مطالعے پر اپنی توجہ مرکوز کرلیں تو ہمیں اس روایت کے ایسے عناصر میں جنہیں جدید کہا جاسکتا ہے کم از کم ایک اصول بڑی قوت کے ساتھ برسرکار نظر آئے گا اور وہ ہے تمام موجود علم کا انکار[2] یہ انکار کسی اور علمیات کی ضرورت پر ختم نہیں ہوتا تھا بلکہ ایک دعوے کو ثابت کرنے کیلیے تھا کہ وجود ممتنع العلم ہے۔ یہاں وجود کی اس مابعد الطبیعیت کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے جو مافوق تجربی تعقل کا موضوع تھی اور عقل کے تمام وظائف و افعال، خواہ وہ تجربیات کی قبیل سے ہوں، اسی پر منحصر تھے۔ اس پس منظر میں علم الوجود کو محال قرار دینا ایک بہت بڑے نتائج پیدا کرنے والے انارکزم کی طرح تھا جو اس روایت میں موجود مزاحمت کی وجہ سے محض ایک سلبی کردار تک محدود رہ گیا اور اس کے ایجابی امکانات عمل، بلکہ تصور میں بھی نہ آسکے۔ تاہم جدیدیت کے ڈسکورس کی بنیاد کے طور پر زینو، ہیراکلائیٹس اور سوفسطائی مکتب فکر[3] کے کردار کو نہ صرف یہ کہ نظر انداز نہیں کیا جاسکتا بلکہ قدیم یونانی حوالوں سے لاتعلق رہ کر جدیدیت کے تسلسل کو بھی کوئی ٹھوس معنوی اساس نہیں دی جاسکتی۔ یونانی عناصر سے جدیدیت نے اپنا مزاج اخذ کیا ہے، یہ بات اعتماد سے کہی جاسکتی ہے، مثلاً:

---

1 حسن عسکری، **جدیدیت** (لاہور: ادارہ فروغ اسلام، ۱۹۹۷ء)، ص: ۲۴۔

Ḥassan Askarī, *Jadīdīyat* (Lāhore: Idara-e-Farogh-e-Islām, 1997), 24.

2 David Miller, *Popper Selections* (Princeton: Princeton University Press, 1984), 30.

3 ہدِ قبل از سقراط میں باقی رہ جانے والوں ناموں میں سے سوفسطائی مکتبِ فکر دو کلیدی مفکرین پروٹاگورس اور غورجیس کی نسبت سے مشہور ہوا۔ یہ قول کہ "انسان ہی ہر شئے کا معیار ہے"، پروٹاگورس ہی سے منسلک ہے۔ یونانی فکر میں علم کا مسئلہ شدت کیساتھ سوفسطائیوں کے ہاں ملتا ہے۔

۱۔ منفی لامتناہیت کا جو تصور زینو نے فاصلے کے فرضی ہونے کی دلیل کے طور پر دیا ہے، اس سے ذہن اور شے کے درمیان موجود عملی اور علمی نسبت اسی منطق کی رو سے غیر حقیقی ہو گئی جس کے استدلال کی بنیاد پر اس کا حقیقی ہونا استوار تھا۔[1]

۲۔ زینو نے چیزوں کے مابعد الطبیعی تناظر کو غائب دماغی سے بننے والا مفروضہ قرار دیا[2] اور ہیراکلائیٹس نے کائنات کی مادی ساخت کو بھی تغیرِ محض پر قائم کر کے ایک طرح سے اس کے علم کو بھی ناممکن بنا دیا[3] اور تیسری طرف ڈیموکرائیٹس نے کائنات کی مادی تحلیل اور تجزیے میں اس کی مابعد الطبیعی تعبیر کو دخیل رکھنے کی جو کوشش کی اس کے نتیجے میں یا تو کسی ایک جہت کو چھوڑنا لازم آنا تھا یا پھر ان دونوں یعنی مابعد الطبیعی اصول اور طبیعی تجزیے کو ایک دوسرے سے غیر متعلق ہو جانا ضروری ٹھہرتا تھا۔ یہیں سے جسم اور ذہن کی دوئی کا وہ دروازہ کھلتا ہوا نظر آتا ہے جسے ڈیکارٹ نے پورا کھول دیا۔

۳۔ رواقیین اور مادیین گو ایک دوسرے کو قبول نہیں کرتے تھے لیکن ایک غیر متعلق کے دائرے میں ان کے بنیادی خیالات نے کم از کم ایک مشترک نتیجہ پیدا کیا اور وہ تھا مادے کی مابعد الطبیعی سٹرکچرنگ۔ یہ نتیجہ آج بھی جدیدیت کے بعض مظاہر میں موثر اور بامعنی ہے۔

۴۔ علم کا ریاضی اور سائنس سے تعلق بھی تاریخ میں پہلی مرتبہ یونانی روایت ہی میں پیدا ہوا۔[4] علوم کی سائنس مرکز تالیف جدیدیت کی اساسیات میں شامل ہے۔ جدیدیت کا وہ حصہ جس کیلیے بدلی ہوئی صورتوں میں ہی سہی مگر مابعد الطبیعات تاحال قابل قبول ہے وہ اسی تالیف کی وارث ہے۔

---

1 Frank Thilly, *A History of Philosophy* (New York: Henry Halt and Company, 1914), 29.

2 Walter Terence Stace, *A Critical History of Greek Philosophy* (Glasgow: University Press, 2010), 55.

3 Stace, *A Critical History of Greek Philosophy*, 73.

4 Peter Adamson, *Classical Philosophy: A History of Philosophy Without Any Gaps* (Oxford: University Press, 2014), 34.

۵۔ یونانی المیہ اپنے اصول اور تفصیل میں ظاہر ہے کہ جدیدیت سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا لیکن فلسفیانہ روایت کی طرح ادبی روایت میں بھی یونانیت کے ابتدائی ادوار ہی میں کچھ بڑی تبدیلیاں اپنی جگہ بنا رہی تھیں۔ ادبی روایت میں اس کا اظہار المیے میں آنے والی بعض بہت بنیادی تبدیلیوں کی شکل میں ہوا۔ ان تبدیلیوں نے ایک تو تقدیر کی مداخلت ختم کر دی اور دوسرے ہیرو کو غائب کر دیا، تیسرے زمانی وحدت اور تسلسل کو ضروری نہ رہنے دیا اور چوتھے ناکامی کو مطلق انجام کی حیثیت سے ہٹا دیا۔ یعنی بالفاظ دیگر اپنی ادبی روایت میں بھی ایک اینٹی تھیسس پیدا کر دکھایا۔

۶۔ یونانیوں کا پیدا کردہ یہی اینٹی تھیسس، خاص طور پر جدید ادبی روایتوں کی سب سے بڑی قوت بنا اور اس سے جدیدیت نے اپنے بعض بڑے مقاصد، مثلاً انسان کی نفسیاتی تنظیمِ نو کو حاصل کر دکھایا۔ یہ ٹھیک ہے کہ یونانیوں نے اپنے تصور انسان میں تبدیلی کا جوہر ضرور داخل کر دیا۔ علم اور وجود کے درمیان پرانی نسبتوں کی ریاضیاتی اور تجربی تردید کے اثر سے روایتی تصور انسان کا علی حالہ برقرار رہنا ممکن نہ تھا۔

۷۔ سوفسطائیوں نے اضافیت کو ذہن اور شے کی اصل قرار دے کر گویا ایک بالکل نئے آدمی اور نئی کائنات کا خاکہ پیش کر دیا تھا۔

گو کہ یہ اضافیت تغیر اور تشکیل بمقابلہ استقلال اور یقین کی صورت حال میں تھی اور اپنے ثبوت کیلیے درکار ٹیکنالوجی دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے اس کے کونیاتی مظاہر سائنسی انداز میں سامنے نہ آسکے لیکن اس کے نتیجے میں آدمی کی ایک نئی نفسیاتی اصول بندی ضرور ہو گئی۔ جدیدیت کو ٹیکنالوجی کی کمک حاصل تھی لہٰذا اس نے اضافیت کے قانون کو کائنات میں ایک تجربی رنگ کے ساتھ کارفرما دکھانے میں کامیابی حاصل کر لی۔

۸۔ تاریخ انسانی میں کم ہی فقرے ہوں گے جو پروٹوگورس کے اس جملے کے برابر تقدیری اور آفاقی نتائج کے حامل ہوں کہ آدمی ہر چیز کی کسوٹی ہے۔[1] جدیدیت کا پرندہ جتنا بھی بڑا ہو جائے یہ پنجرہ اس کیلیے ہمیشہ کافی رہے گا۔ جدیدیت اپنے ہر دور میں اس فقرے سے بننے والے حدود ہی میں رہی ہے۔ جدیدیت جس انسان مرکزی کا

1 مکمل دعویٰ درج ذیل ہے:

"Of all things the measure is Man, of the things that are, that they are, and of the things that are not, that they are not."

عنوان ہے اسے پروٹو گورس نے ڈھائی تین ہزار برس پہلے بیان کر دیا تھا۔

یونانی دور میں فلسفی یا فلسفے کو اس قدر بلند مقام کبھی حاصل نہیں رہا جتنا کہ افلاطون اور ارسطو کے ہاں ملا۔ موجودہ یورپ کی تہذیب پہ اگرچہ باقی ادوار بالخصوص نوفلاطونیت کے اثرات کسی حد تک رہے ہیں، تاہم افکار کی سطح پہ اہلِ یورپ پہ زیادہ اثر افلاطون اور ارسطو کا ہے۔ افلاطون اور ارسطو کے افکار میں پائی جانے والی خامیاں اور نقائص آگے چل کر جدیدیت میں پرزور انداز میں منظرِ عام پہ آئیں۔ یونانی فکر کا "وجود" کی منزل سے آگے نہ بڑھ پانا، عالمِ مثال تک محدود رہنا، صفائے قلب کی بجائے صفائے نفس کا ترجیح دینا، عقلِ کلی (Intellect) اور عقلِ جزوی (Reason) کے امتیاز کو نہ سمجھ پانا، مجرد فکر کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنا، انسانی مرکزیت پہ زور دینا اور روح کی حقیقت سے پوری طرح آگاہی نہ رکھنا؛ یہ تمام یونانی فکر کی وہ خامیاں ہیں جنہوں میں موجودہ یورپ کے ذہنی انحطاط میں اپنا کردار ادا کیا۔[1]

جس طرح موجودہ جدیدیت کی کچھ بنیادیں قدیم یونانی فکری روایت میں پائی جاتی ہیں اسی طرح رومی تہذیبی روایت نے بھی اسے تشکیل دینے والے کچھ عناصر موجود ہیں۔ ان عناصر کی نشاندہی سے پہلے اس بات پر ذہن کو صاف کرلینا مناسب ہے کہ جدیدیت کے فکری اور قدر محدود معنی میں ادبی سرچشمے یونان میں تھے تاہم اس کی تہذیبی اور نفسیاتی ساخت کی تعمیر میں رومی دور کا بھی ایک قابلِ شناخت حصہ ہے۔[2] لیکن رومی دور اور اس میں پیدا ہونے والے تصورات و اقدار زیادہ تر، قوت پر اپنی اساس رکھتے تھے، اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ جدیدیت اپنے بعض گوشوں میں رومنزم سے مناسبت کی بجائے ان کا ایک معکوس اثر رکھتی ہے۔ یہاں تک کہنا بھی درست معلوم ہوتا ہے کہ جدیدیت کے ابتدائی مظاہر براہ راست رومنزم کے ردعمل میں وجود میں آئے۔ چونکہ ہر ورلڈ ویو کو تجزیہ کرتے وقت اس کے منفی محرکات کا جائزہ لینا بھی ضروری ہوتا ہے اس لیے ایک بڑے پس منظر کے طور پر رومنزم کو سمجھے بغیر جدیدیت کا فہم دشوار ہے۔

---

1 حسن عسکری، **جدیدیت**، ص:۲۷۔

Ḥassan Askarī, *Jadīdīyat*, 27.

2 Carl J. Richard, *Why We're All Romans: The Roman Contributions to the World* (Lanham: Rowman & Littlefield Publishers, 2010), 1.

رومی دور

یونانیوں کی طرح رومی روایت بھی دو ادوار کا مجموعہ ہے۔ یونانیوں میں یہ ما قبل سقراط اور مابعد سقراط دور ہے اور رومیوں میں اسے مسیحیت سے پہلے اور بعد کے ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ رومیوں کا ایک جوہر امتیاز ہے جو انہیں اکثر معلوم تہذیبوں سے منفرد بناتا ہے۔ اور وہ ہے تہذیب کے موسس بر قوت سٹرکچر اور نظام کی تشکیل۔ گو کہ قوت کا تصور اپنے عملی مظاہر کے ساتھ پہلے کی تہذیبوں میں بھی مرکزی حیثیت کا حامل رہا ہے، لیکن قوتِ محض کو بنیاد بنا کر آدمی اور دنیا کا ایک بے لچک اور ہمہ گیر تصور وضع کرنا، یہ رومیوں سے خاص ہے۔ رومیوں نے قوت کو تہذیب کے تشکیلی مراتب میں وہی درجہ دیا جو مثال کے طور پر ہندوں تہذیب میں علم کا تھا اور یونانی تہذیب میں خیر کا۔ یونانی، قوت، اخلاق اور علم کے جدلیاتی سانچے میں ڈھلنے کے عمل سے گزرتے رہے مگر رومی تہذیب کا جدلیاتی pattern دوسرا تھا۔ یہاں قوت ہر چیز سے مستغنی بھی تھی اور علم وغیرہ کا کردار بھی اس نے اپنے ہاتھوں میں رکھا تھا۔ دوسری بات جس نے قوت کو اصلِ تہذیب بننے کا راستہ فراہم کیا، وہ ان کی واحد الاساس بین الاقوامیت تھی۔ استبداد، جو قوت کا خاصہ ہے، رومیوں کے ہاں شدت سے موجود تھا مگر اس کی کچھ صورت ایسی تھی جو اسے ان ادوار کے مروج استبداد سے مختلف کرتی تھیں۔ مثلاً ان کے ہاں غلام اور آقا کی تقسیم کا بے لچک نہ ہونا، رومی اور غیر رومی میں شناخت کا ضروری فرق ہونے کے باوجود اس کی بنیاد پر مستقل طبقات کا وجود میں نہ آنا۔

رومیوں نے ٹھیٹھ طاقت سے علوم و فنون کی پوری روایت پیدا کر دکھائی۔ یہ ایک ایسا تہذیبی مظہر ہے جسے سمجھے بغیر جدید مغرب کے اصول اور ان میں پائے جانے والے تضادات گرفت میں نہیں آتے۔ رومن ادوار میں تخلیقی فنون اور تجربی علوم کی جو مضبوط روایت وجود میں آئی اس کا ایک بڑا مقصد قوت کے آئیڈیا کی تشکیل و تجسیم تھا۔ قوت کے آئیڈیا کا قانون میں ڈھلنا اور تسخیر کی نیت سے طبیعی علوم کے منہج کی داغ بیل ڈالنا، خطابت کے اعلیٰ نمونے تخلیق کرنا، طربیے کی روایت کا آغاز کرنا اور خاص طور پر فنِ تعمیر کو بالکل نئی ابتدا اور انتہا تک پہنچا دینا۔۔۔ یہ وہ مظاہر ہیں جن سے قوت کے تمام میکانکس کو، ایک تو سمجھنا ممکن ہوا، اور دوسرے یہ جاننا آسان ہو گیا کہ انسان اگر خود کو اجتماعی وجود کے طور پر تعبیر کرلے تو قوت ہی احکام و اقدار اور اصول و مظاہر کا مبدا بن جاتی ہے۔ مثال کے طور پر رومیوں نے علم کو حس و مشاہدہ تک جو محدود رکھا اس کا بھی بنیادی سبب ان کے

تصورِ قوت میں پنہاں ہے۔ یعنی وجود کی جو سطح تصرف کی حد سے باہر ہے اسے علم کا موضوع بنانا گویا کمزوری کو دعوت دینا ہے۔

مسیحیت قبول کر لینے کے بعد گو کہ رومی کم بدلے مسیحیت زیادہ تبدیل ہوئی، تاہم اس دین کو اپنے نظامِ قوت میں جگہ دینے کیلیے یا جگہ دینے کے نتیجے میں انہوں نے جو فلسفہ اخلاق ایجاد کیا وہ اپنی کلی بناوٹ میں مسیحیت کی کمزوری پسندی کا ازالہ ہے۔ قوت اور اخلاق میں جیسی فعال نسبت رومیوں نے پیدا کی وہ غالباً مغرب جدید کی دنیاوی معموری اور روحانی خلا کا سب سے بڑا سبب ہے۔ رومی اخلاق نفسیاتی کی بجائے اداراتی ہیں اور پورا اخلاقی نظام حکومت و اطاعت کے پیراڈایئم میں اپنی معنویت رکھتا ہے۔ اس نظام الاخلاق کو جدیدیت سے تو مناسبت نہیں ہے لیکن جدید مغرب کا قانونی نظام اور سماجی ذمہ داریوں کا ڈھانچہ بڑی حد تک اس سے ماخوذ ہے۔ مغرب کے اکثر تہذیبی اوضاع رومیوں کی اجتماعیت پرستی کے قدرے بدلے ہوئے مظاہر ہیں۔ جدیدیت نے اسی میں فرد کی گنجائش نکالنے کی کوشش کی۔ انفرادیت کے انکار تک پہنچی ہوئی اجتماعیت پسندی جس میں آدمی ایک ذی شعور وجود سے زیادہ مشین بن کر رہ جاتا ہے، مغرب کا تاحال بڑا دبدہایا المیہ ہے۔ اسے جدیدیت کی پیدائش کے بہت بنیادی سبب کی حیثیت دی جاسکتی ہے، گو کہ یہاں انسان کو مشین ہونے سے نکال کر ایک دوسری انتہا تک پہنچا دیا گیا ہے جہاں وہ شعور کا جبر سہنے والا ایک حیاتیاتی وجود بن کر رہ گیا۔[1]

جیسا کہ اوپر ذکر آیا کہ یونانیوں نے جدیدیت کے کچھ مثبت اسباب پیدا کیے جب کہ رومیوں کے اثرات ملے جلے سے ہیں۔ کچھ مثبت اور اکثر منفی۔ اس پہلو سے کہا جاسکتا ہے کہ جدیدیت اپنی بنیادی طاقت کے ساتھ رومنزم کے خلاف بغاوت ہے۔ یہ بغاوت چونکہ زیادہ تر فرد کے دائرے میں ہے لہٰذا اس کا اثر انسانیت کے ان حصوں تک نہ پہنچ سکا جہاں قانون، بین الاقوامی تعلقات، معیشت، نظام العلم اور تہذیب کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ ان حصوں میں رومی تسلط ابھی ٹوٹا نہیں ہے۔ ذیل میں رومی تہذیب کے بعض ایسے خواص کی نشاندہی کی جارہی ہے جنہوں نے جدیدیت کی تشکیل میں براہ راست یا بالواسطہ اور کوئی تائیدی یا تردیدی کردار ادا کیا۔

ا۔ رومیوں نے قوت کی بنیاد پر منظم سیاسی ادارے بنائے تھے بعد میں جمہوریت بھی قوت اور سیاست کے اس

1 Michel Foucault, *The Will to Knowledge: A History of Sexuality, Vol I*, trans. Robert Hurley (New York: Pantheon Books, 1978), 138.

لزوم کو توڑنے میں ناکام رہی۔ بلکہ تنظیم کا ہر تصور رومیوں کے کھینچے ہوئے حدود سے باہر کبھی نہیں نکل سکا۔ اہل جدیدیت نے چونکہ قوت کی سیاسی حتمیت کے غیر ریاستی عوامل بھی دیکھ لیے تھے لہٰذا ان کے اندر قوت اپنے ہر آئیڈیا میں غیر انسانی قرار پائی۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ قوت کا انکار جدیدیت کا سنگ بنیاد ہے۔ قوت اور اس کے تقریباً تمام مظاہر سے عدم مناسبت نے جدیدیت کو فرد کا ترجمان تو بنا دیا لیکن انسان کے اجتماعی وجود اور اس کے ضروری تقاضوں سے ایک نیم اخلاقی اور نیم رومانوی فضا میں بے نیاز کر دیا۔ جدید دنیا میں چونکہ طاقت اپنے کلاسیکی حدود تک محدود نہیں رہی بلکہ اس کا دائرہ علم، معیشت وغیرہ تک پھیل گیا اور اس نے کئی مجرد اور پیچیدہ میکانزم پیدا کر لیے، اس لیے جدیدیت کے متوازی ڈسکورس میں ہر طرح کی حاکمیت کا انکار ایک مزاج بن کر راسخ ہو گیا۔ اس کی آخری مثال وہ ہے جو پوری طرح پس جدیدیت میں ظاہر ہوئی، یعنی معنی اور آفاقیت کا انکار۔ یہ خیال ٹھیک نہیں ہے کہ یہ انکار پس جدیدیت سے پہلے ایک مربوط حالت میں موجود نہ تھا۔ جدیدیت کے وسطی دور میں ہی معنی کو عام سے خاص اور آفاقی سے شخصی بنانے کا رجحان ایک بڑے پھیلاؤ کے ساتھ نظر آتا ہے، پس جدیدیت نے بس اتنا کیا کہ شخصی معنی کی قید کو بھی توڑ ڈالا اور اور خود نفسِ معنی کو مشتبہ اور معطل کر دیا۔ قوت کے ظلم ہونے کا وہ تصور جس نے انکارِ معنی تک پہنچایا پس جدیدیت نہیں ہے بلکہ جدیدیت کے بنیادی تصورات میں داخل تھا۔ قوت کے مرکز پر قائم اس جدلیت نے جو رومنزم اور جدیدیت کے درمیان جاری ہوئی، مغرب کا تہذیبی پھیلاؤ بڑھانے میں بہت بنیادی کردار ادا کیا۔ جدیدیت کے اینٹی تھیسس نے رومن تھیسس کو گویا زندہ اور فعال رکھا۔

۲۔ رومی تہذیب میں تجربیت کو اساس علم ٹھہرایا گیا تھا۔[1] جو آگے چل کر مغرب کے تصور علم کی بنیاد بنی۔ جدیدیت کے نظریۂ علم کی تحلیل کی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اس نظریے کے بننے کا تقریباً سارا عمل رومی تصورِ علم کو نظر میں رکھ کر انجام پایا ہے۔ نشاۃ الثانیہ نے مغرب کی علمی نسبت یونان کی طرف کر کے رومی نظریۂ علم سے انحراف نہیں کیا تھا بلکہ قوت کو اس کے مرکز سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ جدیدیت کی تحریک میں ایک بنیاد سے دوسری بنیاد تک منتقلی کا یہ عمل بھی قابل قبول نہ تھا کیونکہ دونوں صورتوں میں ذہن اور علم باعتبارِ ساخت

1 Jason L. Saunders, *Greek and Roman Philosophy After Aristotle* (New York: The Free Press, 1994), 5.

اجتماعی اور آفاقی تھا اور علم کے صحیح و غلط ہونے کے معیارات اتنے بے لچک اور حاکمانہ تھے کہ فرد کے ذہن کو اپنی خلاقی دکھانے کا کوئی موقع میسر نہ رہ گیا تھا۔ جدیدیت نے علم کی تعریف، مقصود اور اس کی ساخت کو اس حد تک بدلنے کی مسلسل کاوش کی کہ ذہن اپنے موضوع کے ساتھ طے شدہ نسبتوں کا قیدی بن کر نہ رہے بلکہ ان دونوں کے بیچ تعلق کے نئے زاویے دریافت کرے اور ان سے حاصل ہونے والے نتائج کی مدد سے چیزوں کو شعور میں ہونے کی نئی صورتیں فراہم کرے اور وجود میں ہونے کی نئی حالتیں۔ اس پس منظر میں جدیدیت نے علم کے تجربی اور غیر تجربی ہونے کی بحث کو سرے سے ناقابل التفات اور غیر انسانی قرار دے دیا۔ علم کی تمام تعریفات سے بغاوت کر کے گویا جدیدیت نے رومنزم سے نسبت کے تناظر قوت کے داخلی اور خارجی دونوں مظاہر کو رد کیا مگر اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے خلا کو یا تو اہم نہیں سمجھا گیا یا پھر اسے جدید مغرب نے جدیدیت کے ڈسکورس کو چھوڑے بغیر اس سے باہر نکل کر پُر کیا۔

۳۔ رومیوں کا ایک بڑا امتیاز یہ بھی تھا کہ انہوں نے قانون کی علمی اور عملی تشکیل کی[1] ان کے نزدیک قانون، قوت اور داخلی و خارجی تنظیم کا مجموعہ تھا۔ یہ تصورِ قانون رومیوں کی ایسی تخلیق تھا جس میں تاریخ فرسودگی کے آثار نہ پیدا کر سکی۔ جدیدیت میں گو کہ رومی تصور قانون یا محض قانون پر زیادہ کلام نہیں ملتا لیکن ان کے ڈسکورس کی مجموعی معنویت ایسی ہے کہ قانون کا جوہرِ پابندی ان کے ورلڈ ویو سے مطابقت نہیں رکھتا۔ ان کے شخصی آزادی کے تصور میں بہر حال اتنی قوت تھی کہ اس کے زیر اثر مغرب میں قانون کی سطح پر رومنزم اور جدیدیت کا تضاد قریب قریب حل ہو گیا۔ مغربی تہذیب کی پوری تاریخ میں قانون اور قانون سازی کی ایسی صورت حال ہے جہاں رومنزم اور جدیدیت کے ٹکراؤ سے اور ان میں سے کسی کو منہا کیے بغیر ایک synthesis وجود میں آ گیا اور شخصی آزادی کو قانون کے ایک محور اور مقصود کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ یہ مغرب کی تہذیبی پیش رفت میں ایک بڑا مرحلہ تھا جو جدیدیت وجود میں نہ آئی ہوتی تو طے نہ ہوتا۔

جدیدیت کی پیدائش کا ماحول اور اس کی نشوونما کے اسباب مغربی تہذیب میں واقع ہوئے ہیں۔ یہ مغربی تہذیب کا وہ مجموعی مظہر ہے جس میں اس تہذیب کی تقریباً تمام اقدار کسی نا کسی پہلو سے رونما ہیں۔ اس تہذیب کی کلی

1 Carl J. Richard, *Why We're All Romans: The Roman Contributions to the World* (Lanham: Rowman & Littlefield Publishers, 2010), 55.

ساخت ایسی ہے کہ اس کے تمام بنیادی علمی، نفسیاتی اور عملی عوامل اپنے referential context میں جدیدیت کا ایک ایسا فعال جوہر رکھتے ہیں جس کی کارفرمائی اس تہذیب میں تغیر و تبدیلی کی تیز رفتاری کے باوجود کبھی ماند نہیں پڑی بلکہ اس میں تبدیلی کا ہر عمل جدیدیت ہی کے دائرے میں برپا ہوتا آیا ہے۔ اس کا قدیم بھی اپنے دوران اطلاق میں جدید ہی تھا جسے بدلنے کا محرک ہمیشہ اپنے ماحول اور ضروریات سے سازگاری کا جذبہ رہا ہے۔ یونانیوں کی مشہور تثلیث (نفسیات، وجودیات اور کونیات) ہو یا رومیوں کے معروف اصول یعنی پاور اور آرڈر ہوں، ایک مستقل اضافیت اور باہری پن کے عناصر سے مرکب تھے اور اس ترکیبی ساخت سے مغرب اپنی تہذیبی تاریخ کے کسی بھی مرحلے پر نکل نہیں سکا۔ حتیٰ کہ ان ادوار میں بھی جنہیں ادوار مظلمہ کہا جاتا ہے، رومیوں اور یونانیوں کے امتزاج سے بننے والا ورلڈ ویو معطل یا متاثر نہیں ہوا۔ کلیسا اور کلیسا کی حکومت، یونانی فکر و عمل کی اساس پر ہی قائم رہی اور اس سے بغاوت نے بھی اس آدمی کو نہیں بدلا جس نے اس کا غلبہ قبول کر رکھا تھا۔ اس بات کو سمجھنا بہت ضروری ہے کہ جدیدیت اپنی تہذیبی رو سے کسی مکمل انقطاع اور انحراف کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اسی کے ترمیم شدہ تسلسل کا نام ہے۔ جدیدیت کا ترجمان بن کر تو ظاہر ہے کہ اس بات کی تائید نہیں ہو سکتی لیکن ایک غیر جانبدارانہ تنقیدی مطالعہ کم و بیش اسی نتیجے تک پہنچاتا ہے کہ جدیدیت کی تعمیر میں اسٹرکچر بدلے ہیں لیکن معمار نہیں۔ مثال کے طور پر مغربی تہذیب کے اولین مظہر یعنی یونانی تہذیب میں جاری علم اور طاقت کی پیکار کو رومیوں نے حل کر دکھایا تھا، جدیدیت نے حالات کی مناسبت سے کہیں اس پیکار کو برقرار رکھا اور کہیں رومن synthesis کو قبول کر لیا اور علمی پیش رفت اور قوت کے تسلسل میں حاصل ہونے والی کامیابیوں کو اس تضاد کے جواز پر دلیل بنایا۔ اسی طرح یونانی نفسیات کے اُم التصور یعنی خیر اور ابُ التصور یعنی اخلاق کو رومیوں نے مابعد الطبیعی اور عقلی فضا سے نکال کر جس طرح قوت اساس آرڈر میں سمویا تھا، اس کا حوالہ نکال دیا جائے تو جدیدیت اپنی تعریف کے ایک ضروری عنصر سے خالی رہ جائے گی۔ یہی صورت حال اس de-metaphysicalization کی ہے جسے رومیوں نے گویا علم کی شرط بنا دیا تھا۔ جدید تجربیت آج بھی انہی اصول پر استوار اور انہی حدود سے محدود ہے جو رومیوں نے وضع کیے تھے۔ ایک تخلیقی اور ادبی روایت کے طور پر لگتا ہے کہ جدیدیت نے کم از کم رومی de-humanization کو رد کیا لیکن یہ حقیقت نہیں ہے۔ انسان کو اس کی عقلی، جمالیاتی، اخلاقی اور روحانی conditions سے نکال دینے کا جو عمل جدید ادب میں نظر آتا ہے وہ

صورت میں یقیناً رومن de-humanization سے بہت مختلف بلکہ متضاد ہے لیکن اپنے معنی میں یہ اسی سے جڑا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ ہیومنزم کی وہ تھیوری یا نعرہ بھی جو جدیدیت کی بہت بڑی اساس کی حیثیت رکھتا ہے، اپنے تمام تر دروبست میں پرانے آدمی کا انکار ہے نئے آدمی کو وجود میں لائے بغیر۔ اس تھیوری میں آدمیت کو جن عناصر کا مجموعہ بتایا جاتا ہے ان کا مصداق تخیل سے باہر موجود نہیں۔ کلاسیکی تناظر میں تو یہ بات بہت سادہ سی ہے کہ مابعد الطبیعات کا انکار، انسان کے انکار کو لازم کرتا ہے، تاہم غیر کلاسیکی زاویے سے بھی کہا جاسکتا ہے کہ ایسا تصور انسان بھی انسان کا انکار ہی ہے جس میں انسانیت اپنی موجودہ conditions سے نکل کر کچھ تصوراتی conditions تک محدود ہو کر رہ جائے اور انسان کے وہ امکانات محض تصوراتی بن کر رہ جائیں جو کسی مابعد الطبیعی سیاق وسباق میں بامعنی اور نتیجہ خیز ہو کرتے ہیں۔

رومانیت پسندی اور تحریک انتقاد

اگر ہم جدیدیت کی ادبی اور فلسفیانہ جہتوں کا مطالعہ کریں تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس روایت میں بہت سے عناصر رومانویت اور تحریک انتقاد سے بھی وجود میں آئے۔[1] مثال کے طور پر عقل اور تخیل میں جوڑ پیدا کر دکھانا جدیدیت کا ایک امتیاز ہے، اسی طرح انسان کی مجرد یا واقعاتی اجتماعیت کی مسلسل گونج میں فرد کی آواز کیلیے جگہ بنانا بھی اس کا بہر حال ایک ایسا کارنامہ ہے جس نے انسان کے بارے میں بعض تصورات کے استبداد کو توڑ دیا۔ اس سلسلے میں اور بھی کئی امتیازات ہیں جن کا کریڈٹ اس تحریک یا روایت کو دیا جانا چاہیے۔ ذہن، شے اور احساسات میں ایک فعال ربط پیدا کر کے جدیدیت نے جس طرح پورے عالمِ تعریفات میں تبدیلیاں برپا کیں اور ان تبدیلیوں سے کم از کم فلسفے اور تخلیقی فنون کی سطح پر جو نتائج نکال کر دکھائے وہ اپنی جگہ خاصے اہم ہیں۔ انہوں نے دنیا اور انسان کے بارے میں کلاسیکی تصورات کو ہی نہیں بدلا بلکہ خود دنیا اور انسان کو بھی خاصی گہرائی میں بدل ڈالا۔ تحریک انتقاد سے ان کی نسبت ذرا پیچیدہ سی ہے۔ ان کے یہاں علم وغیرہ کی تعریف اور حدود وہی ہیں جو کانٹ یا اس کے دبستان نے وضع کیے ہیں تاہم انہوں نے تخیل کی کمک فراہم کر کے تجربیت کو عقل کی تمام

1 David E. Wellbery, "Romanticism and Modernity: Epistemological Continuities and Discontinuities," in *Romanticism and Modernity*, ed. Thomas Pfau and Robert Mitchel (London: Routledge, 2012), 13-25.

سرگرمیوں پر مسلط ہونے سے روک دیا۔ جدیدیت نے باقاعدہ ایک نظام الشعور تخلیق کیا جو تنقیدی نظام العلم سے مختلف کم تھا اور ممتاز زیادہ۔ انہوں نے علم کے نفی و ایجاب کے قطبین کو شعور کی آخری حد نہ بننے دیا اور تخیل وغیرہ کے نتائج کو بھی شعور کی پرداخت اور تعمیر میں استعمال کیا۔ ایک بے لچک ہاں اور نہیں کی فضا سے نکال کر شعور کو احساسات اور تخیل سے مانوس کرنے کا جو عمل جدید فلسفہ و ادب میں دکھائی دیتا ہے اس کا اظہار پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ مابعد الطبیعیات کے انکار سے پیدا ہونے والے خلا کو جدیدیت نے ان شعوری احوال سے بھرنے کی کوشش کی جو معلومات کے دائرے میں نہیں آتے تھے۔ شعور کی ساخت میں پیدا ہونے والی اس بہت بڑی تبدیلی سے ایک تو یہ ہوا کہ علم، شعور کا بنیادی مقصود نہیں رہ گیا اور دوسرا، دنیا یا کلاسیکی اصطلاح میں حقائق کے ساتھ انسان کے انفرادی تعلق کے راستے نکل آئے یعنی ایک Active Subjectivization کے ایسے عمل کا آغاز ہو گیا جس میں شے کے مشترکہ تناظرات کے علاوہ بھی کچھ نئی اور موثر معروض/موضوع تعلق کی صورتیں نکل آئیں جو شعور، جس کا ماڈل فرد کا شعور ہے، جو شعور کی مسلسل تشکیل میں علم یعنی مشترک تناظرات کے حاصل سے بڑھ کر موثر اور بعض صورتوں میں زیادہ اہم ہیں۔ جدیدیت کے تمام مظاہر مذکورہ بالا نظام الشعور سے پیدا ہوئے ہیں اور اس نظام کو نظر انداز کر کے اس تحریک کا تجزیہ نہیں ہو سکتا۔ جدیدیت نے ایک عجیب سا Paradoxical Pattern بنایا ہے جس کا ہدف کلاسیکیت کا رد ہے۔ اس ہدف کو پانے کیلیے انہوں نے تضادات کو بھی ان کی وجہ تضاد دور کیے بغیر استعمال کرنے میں کوئی جھجک سے کام نہیں لیا۔ مثلاً مابعد الطبیعیات کے انکار میں رومیوں کی بنا کردہ تجربیت کو پوری قوت سے استعمال کیا اور دوسری طرف تجربی علوم اور ان سے جڑی ہوئی طاقت کے دائرے سے نکلنے کیلیے یونانی تعقل اور اس کے تجریدی مزاج کو کام میں لانے سے دریغ نہیں کیا۔ یونانی اور رومی، جدیدیت کا ماضی بعید ہیں، ان کے بعد بھی مغربی تہذیب میں ایسے کئی مظاہر موجود ہیں جنہیں جدیدیت کی پیدائش کے اسباب کی حیثیت دی جا سکتی ہے۔ ان اسباب کی ترتیب بنائی جائے تو کچھ یوں ہو گی:

یورپی تہذیب کی مذہبی تاسیس کیلئے پہلی نشاۃ الثانیہ میں عقل اور وحی کی مطابقت کے اصول پر جو کام ہوا اس نے کم از کم دو چیزیں پیدا کیں۔ ایک مسیحی علم الکلام اور دوسرا سائنسی انقلاب۔ علم الکلام کی تشکیل پہلے ہوئی اور سائنسی انقلاب، عقل کو آزادی کے ساتھ استعمال کرنے کے نتیجے میں وجود میں آیا۔ لیکن یہ دونوں واقعات اسی یونانیت کے نتائج تھے جس میں ڈھلنے کیلیے نشاۃ الثانیہ کا ڈول ڈالا گیا۔ یعنی عقل کا وجودیاتی اور کونیاتی کردار۔ سائنسی انقلاب

پہلی نشاۃ الثانیہ کا غیر مطلوب نتیجہ تھا جس کی وجہ سے اس کا حقیقی مقصود یعنی مذہب کی تعقلی توجیہ و تعبیر، بہت بڑی حد تک متاثر ہو گیا۔ مسیحیت اور یونانیت میں مطلوبہ اتحاد کی بجائے ایسی متصادم دو لختی پیدا ہو گئی جس میں مسیحیت کو سپر ڈالنی پڑی۔ اب گویا علم اور عقیدے میں دوئی بلکہ نزاع کا وہ دروازہ کھل گیا جس کا سدباب پہلی نشاۃ الثانیہ کے ایجنڈے میں شامل تھا۔ دوسری نشاۃ الثانیہ، اس رخ سے دیکھیں تو علم کو حتمی فتح دلانے کیلیے برپا ہوئی تھی جس نے یورپ کے مسیحی تشخص کو یونانی تشخص سے بدل دیا۔ یہاں یونانی تشخص یا یونانیت سے مراد وہ مستقل تناظر ہے جس سے یونانی روایت میں وجود و شعور کے تمام مظاہر کو ایک کل میں ڈھال کر دیکھا جاتا تھا۔ مابعد الطبیعی حقائق میں وحدت کا انکار بھی اسی پر انجام پاتا تھا۔ سائنسی انقلاب نے یونانی کونیات میں بھی پہلی مرتبہ ایسی دڑاڑیں ڈال دیں جنہیں بھرنے کی کوئی مذہبی اور سیاسی قوت یورپ کو دستیاب نہ تھی لیکن کائنات کی ریاضیاتی تنظیم کا یونانی تصور اس شکست وریخت میں بھی برقرار رہا جس کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ سائنسی انقلاب نے یونانی کونیات کے اطلاقی نمونوں پر تو خط تنسیخ پھیر دیا لیکن اس کے اصولی ڈھانچے کو کوئی گزند نہیں پہنچائی یا اس سے لاتعلق رہا۔ ان معنوں میں یہ خیال غلط نہیں ہے کہ سائنسی انقلاب نے یونانی کونیات کے محض تجربی حصے کو مسمار کیا اس عمارت کا زیادہ حصہ محفوظ رہا۔ دوسری نشاۃ الثانیہ کے ساتھ یہی واقعہ ہوا کہ یونانیت کے اصول کی پاسداری کی ہی شدت کی وجہ سے وہ حرکت پیدا ہوئی جس نے خود یونانیت کے حدود توڑ دیے۔

نشاۃ الثانیہ

مغربی تہذیب اپنے غیر منقطع تسلسل میں نشاۃ الثانیہ کا نتیجہ ہے۔ گو کہ نشاۃ الثانیہ کا فوری محرک مذہبی تھا اور اس میں بنیادی ترین مسئلہ وحی اور عقل کے فعال رشتوں کی تلاش نو تھا۔[1] بائبل کے عبرانی دروبست اور اس کی تفسیری روایت میں عربیت کے غلبے کی وجہ سے مغرب کو ایک مجموعی تہذیبی اور ذہنی انفرادیت اس وقت کے کچھ لوگوں کے احساس کے مطابق میسر نہ تھی۔ اپنی تحریک کی مذہبی اور علمی تاسیس اور احیا کیلیے معروف انسانی تاریخ میں یہ سب سے بڑی تحریک تھی جس نے اپنے مقاصد ہی حاصل نہیں کیے بلکہ ان مقاصد کے حصول کے بعد تجربے یا تصور میں آنے والے دیگر اہداف کو بھی اپنی دسترس میں لے کر دکھایا۔ نشاۃ الثانیہ اپنے ابتدائی دور ہی میں نشاۃ

1 Michael Allen Gillespie, *The Theological Origins of Modernity* (Chicago: Chicago University Press, 2008), 8.

جدیدہ بن گئی تھی جس نے مغربی تہذیب کو اس کے تمام اصول فراہم کیے۔ اس تحریک کا اولین مقصد یا نعرہ تو یہ تھا کہ ہمیں اپنی اصل یعنی یونانیت اور رومیت کی طرف پلٹنا چاہیے لیکن جلد ہی اس کے ضمن میں دیگر مقاصد بھی بنتے چلے گئے۔ نشاۃ الثانیہ یا تحریک احیاء العلوم سے جدید مغربی تہذیب کے اصول و مبادی وضع ہوئے۔ گو یہ حرکت ماضی کی طرف تھی لیکن اس کے نتیجے میں مستقبل کی بھی تشکیل ہوئی اور یہی اس تحریک کا اصل ہدف تھا۔ چونکہ جدیدیت بھی مغربی تہذیب کے کل کا ایک بڑا جزو ہے اس لیے اس کے بنیادی اسباب و عوامل کی تحقیق میں نشاۃ الثانیہ میں پائے جانے والے ان عناصر تک رسائی ضروری ہے جو وجود میں نہ آتے تو جدیدیت تصور کی حد تک بھی غیر موجود رہتی۔ نشاۃ الثانیہ کی تحریک کے بارے میں یہ کہنا تو ممکن نہیں کہ اس میں فرد کو مجموعی تصور انسان میں بنیادی حیثیت دی گئی تھی تاہم ایک پہلو ایسا ہے جس پر غور کیا جائے تو اس تحریک کو جدیدیت کی بالفعل بنیاد کہنا ممکن ہو جاتا ہے، اور وہ پہلو ہے عقل کا۔ تحریک احیاء العلوم دراصل عقل کو وحی کے متوازی بلکہ اس پر حاوی رکھنے کی ایک نہایت منظم، مربوط اور نتیجہ خیز تحریک تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس تحریک میں کارفرما تصور عقل اپنی بناوٹ میں کلاسیکی تھا لیکن تعقل پر اصرار نے ان کے تصور انسان میں فرد کی مرکزیت کا راستہ کھول دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس تحریک کے اولین مظاہر میں سے ایک مظہر عقل کی آزادی کے نعرے کی صورت میں بر آمد ہوا۔ ظاہر ہے کہ عقل اور آزادی کے اجتماع سے ایک طرف وحی کے انکار کی روایت کا آغاز ہو سکتا ہے اور دوسری جانب اجتماع پر فرد کی فوقیت کا ناگزیر ہونا واجب التسلیم ہو جاتا ہے۔ اس جہت سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جدیدیت نشاۃ الثانیہ کے درخت کا آخری پھل ہے جس نے ان کے تصور عقل اور نظریہ آزادی سے اپنا سامان وجود اخذ کیا ہے۔

جدیدیت پر گفتگو کرتے ہوئے اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ کلاسیکیت کی مکمل تریدی پر استوار ہونے کے باوجود اس کا Mechanism بڑی حد تک نشاۃ الثانیہ سے منعکس ہونے والی کلاسیکیت سے قریبی مناسبت رکھتا ہے۔ چیزوں کو ایک کل میں دیکھنے کی روایت جو کلاسیکیت کا ایک امتیاز ہے، بڑی حد تک جدیدیت میں بھی کارفرما نظر آتی ہے۔ اسی طرح عقل کی حجیت پر اعتقاد، جدیدیت میں بھی کم و بیش ویسا ہی ہے جیسا کہ کلاسیکی روایت میں تھا۔ صرف انفرادیت پسندی اور غیر محدود آزادی کے تصورات ایسے ہیں جو ان دونوں روایتوں میں حدِ فاصل کا کردار ادا کرتے ہیں۔ جدیدیت فی الحقیقت فرد اور اس کی مطلق ذہنی اور وجودی آزادی کا مذہب ہے جو بعض اوقات عقل کی حجیت کا بھی انکار کر دیتا ہے۔ ان امتیازات کے باوجود جدیدیت کوئی ایسا واقعہ نہیں ہے جس کا کوئی

ماضی نہ ہو یا جس کے کچھ قابلِ شناخت اسباب نہ ہوں۔ یہ مغرب کے تہذیبی تسلسل ہی کی ایک کڑی ہے اور اسے اس سیاق و سباق سے نکال کر نہیں سمجھا جاسکتا۔ یہ بڑی غلطی ہو گی اگر ہم دو عالمی جنگوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تاثراتی اور نفسیاتی فرد پرستی اور جذبۂ انکار ہی کو ساری جدیدیت سمجھ لیں۔ اس سے ایک تخلیقی اور ادبی روایت ضرور شروع ہوئی جسے جدیدیت کے دائرے میں جگہ بنانے کا موقع بھی مل گیا لیکن خود جدیدیت اس سے پرانی بھی ہے اور اس تک محدود بھی نہیں ہے۔ یعنی محض ادبی تخلیقی روایت میں ضم نہیں ہوئی۔ جدیدیت کو اگر دوسرا عنوان دینا ہو تو یہ روشن خیالی کی تحریک ہے، جس پر سب سے بڑی ضرب عالمی جنگوں سے لگی۔ لہٰذا اس کے بعض عناصر کا رد عمل میں ایک غیر متوازن اور موضوعی اظہار ہوا جس نے خود کو جدیدیت کے نام سے موسوم کر دیا۔ حالانکہ یہ جدیدیت کا ایک ہنگامی مظہر تھا، جس نے بس جدسیدیت کا لفظ متعارف کروایا، اس کے معانی پہلے سے فعال حالت میں موجود تھے۔

یونانی علوم کے ڈسپلنز کی طرح تحریک احیاء العلوم کے بھی تین اصول تھے: وجودیاتی، کونیاتی اور نفسیاتی۔ ٹھیٹھ نشاۃ الثانیہ، مغربی تہذیب کے وجودیاتی اصول کی بازیافت کا عمل تھا۔ روشن خیالی کی تحریک کا آغاز کونیاتی تھا اور منتہا نفسیاتی۔ ان ادوار میں کائنات اور انسان کے بارے میں علوم کی باقاعدہ داغ بیل پڑی اور مغربی تہذیب کا ورلڈ ویو اصولی اور اطلاقی دونوں جہتوں سے تکمیل کو پہنچ گیا۔ نشاۃ الثانیہ کا تصور حقیقت یہاں تک پہنچتے پہنچتے وجودیاتی کم رہ گیا بلکہ کونیاتی اور آگے چل کر نفسیاتی بھی ہو گیا۔ سائنسی انقلاب، تشکیک اور روشن خیال انتقاد کے داخلی امتیازت کے باوجود ان کا ایک مشترک نتیجہ یہ نکلا کہ خدا، حقائق کی فہرست سے خارج ہو گیا اور تعقل کا موضوع نہ رہا۔ یہیں سے انکار کی وہ روایت پیدا ہوئی جو خدا تک محدود نہ رہی بلکہ اس کی لپیٹ میں تقریباً تمام مسلمات اور حقائق آ گئے۔ یعنی وہ تمام اصول چیلنج ہو گئے جن سے انسان اور دنیا بھی متعین ہوا کرتے تھے۔ یہ انکار وہ بیج ہے جس سے جدیدیت کا حیاتیاتی جنم ہوا۔

خلاصہ بحث

تمام تر صراحت کو پیش نظر رکھا جائے تو بآسانی یہ نتیجہ بر آمد ہوتا ہے کہ جدیدیت ایک دم سے رونما ہونے والا واقعہ نہیں، بلکہ یہ ایک فعال عنصر کی حیثیت سے تمام مغربی روایات میں کسی نا کسی صورت میں موجود رہی ہے اور اپنی موجودہ صورتحال تک کئی مراحل سے ہو کر آئی ہے۔ مغرب کے تہذیبی تسلسل میں جدیدیت کی فکری اساس

یونان قدیم کے علمی رویوں میں نظر آتی ہے، جہاں ایک اپنی نوعیت کا جدید اصول کار فرما تھا، یعنی تمام موجود علم کا انکار۔ علاوہ ازیں زینو کے ہاں موجود منفی لامتناہیت کا تصور، ہیر اکلائیٹس کے مابعد الطبیعات کی بابت نظریات، ڈیموکرائیٹس کی طرف سے کائنات کی مادی تحلیل و تجزیہ میں مابعد الطبیعی تعبیر کی شمولیت، تقدیر کی مداخلت ختم کرتا یونانی المیہ، سوفسطائیوں کا نظریہ اضافت، رواقین اور مادیین کے ہاں مادے کی مابعد الطبیعی سٹرکچرنگ، علوم میں ریاضی اور سائنس کا یکجا ہونا؛ یہ سب وہ عناصر ہیں جو جدید مغرب کی تہذیب میں جڑ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس سے اگلے مرحلے میں مغربی تہذیب کی تہذیبی اور نفسیاتی تعمیر رومی دور میں عمل آئی۔ رومی ادوار میں قوت کے بل بوتے پہ منظم سیاسی اداروں کی تشکیل، تجربیت کو اساس علم کا درجہ دینا، قانون کی علمی اور عملی تشکیل اپنے اعتبار سے وہ تاریخی عناصر ہیں جنہوں نے جدیدیت کے تسلسل میں اپنی نوع کے اثرات مربت کیے۔ رومانیت کی تحریک اور تحریک انتقاد میں عقل و تخیل کی نزاع اور اس کے انضمام کی کوشش کے ساتھ ساتھ عام فرد کی آواز کو اجتماعیت میں بلند کرنے جیسے کارنامے سرانجام ہوئے جو تاحال جدیدیت کے امتیازات میں شامل ہیں۔ سابقہ مذکورہ عناصر جدیدیت کے بعید اسباب ہیں، جبکہ نشاۃ ثانیہ قریب کا مظہر ہے جسے جدیدیت کو فیصلہ کن شکل میں لانے میں اہم سبب کا درجہ حاصل ہے۔ اس دور کے معاصر رجحانات اور اس کے بعد پیدا ہونے والے حالات و اقعات جو قریب کی تواریخ کا حصہ ہیں، بہ حیثیت مجموعی جدیدیت کی آب یاری کا سروسامان رکھتے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆